"تازہ تصنیف اور مصر کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے حامیوں کے لیے دعوتِ مبارزت اور کھلا چیلنج ہے۔
کتاب اول سے آخر تک داعیانہ جوش و خروش کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اُن کے لیے جن کے ہاتھوں میں
مصری سیاسیات کی باگ ہے، اور اُن کے لیے جو مصر کی دولت و ثروت سے نفع اندوز ہو رہے ہیں،
اور اُن کے لیے جو دین کی نمائندگی کے دعویدار اور سرکاری حلقوں میں اس کے ترجمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔
ان سب کے لیے کھلا چیلنج ہے۔ مصنف کا کہنا یہ ہے کہ "ملک کی موجودہ معاشی و معاشرتی حالت عوام
کو شیوعیت، (کمیونزم) کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اگر اس کا جلد سے جلد تدارک نہ کیا گیا، تو صورتِ حال
خطرناک ہو جائے گی اور اس کا وبال سیاست کاروں، سرمایہ داروں اور دین کے غلط اور خود ساختہ
اجارہ داروں پر عائد ہو گا" مصنف نے "اِنِّیْ اَتَّھِمُ" (میں مجرم قرار دیتا ہوں) کے زیر عنوان ملک کے
ایک ایک گروہ کو للکارا ہے اور ان کی خامیاں اور کوتاہیاں ان کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں اور اس
سلسلے میں ایسی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے جنہیں پڑھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

مصری سوسائٹی میں اخلاقی انحطاط کس حد تک پہنچ گیا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"میں مجرم قرار دیتا ہوں! ہاں! میں موجودہ معاشرتی صورتِ حال کو اس بات کا مجرم قرار دیتا
ہوں کہ کوشش، اور بدلہ کے درمیان، توازن، و تناسب کی حیثیت افسانہ سے زیادہ نہیں۔
اور یہی وجہ ہے کہ افراد اور جماعتوں میں روز بروز بے اطمینانی پھیل رہی ہے۔ اس میں ہر فرد
کے لیے ترقی کے یکساں مواقع ملنا ناممکن ہیں۔ مصر میں یہ کہاوت ہے کہ لڑکا طفل، بچا نٹ کر اچھے
والدین کے ہاں پیدا ہوتا کہ ترقی کی ہر ممکن راہ اس کے سامنے کھلی ہوئی ہو، اور وہ راہ کی دشواریوں
کو اچھلتا پھاندتا طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ اور اگر وہ والدین کا معقول انتخاب
نہ کر سکا ہو، تو کم سے کم ایسی بیوی تلاش کرے، جس نے والدین کا اچھا انتخاب کیا ہو اور کسی وزیر
یا مالدار آدمی کے گھر پیدا ہوئی ہو، تاکہ شوہر کو اپنے بازوؤں پر لے کر اڑ جائے۔ اور اگر بیوی
بھی والدین کا معقول انتخاب نہ کر سکی ہو، تو پھر اس نے اپنے چہرے کا رنگ و روغن ہی درست
کر رکھا ہو (قَدْ اَحْسَنَتْ اِخْتِیَارَ تَقَاطِیْعِھَا وَمَلَامِحِھَا)۔ اور یہ وہ نمونہ ہے جس سے

تمام عقدے حل ہو جاتے ہیں اور وہ شخص جس طرح چاہے اسے لے کر حکام کے پاس آ جا سکتا ہے ۔۔۔۔ (صفحہ ۲۰-۱۹)

یہ ہے مصر کی موجودہ معاشرت اور ارباب حکومت کا اخلاق جس کے خلاف جواں سال مصنف نے علم بغاوت بلند کیا ہے۔

مصر کے ایک روشناس شاعر محمود ابوالوفا کا ایک مزاحیہ قطعہ بھی اس سلسلے میں سن لیجیے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ مذاق نہیں تلخ حقیقت ہے، جو ظرافت کے رنگ میں شاعر کی زبان پر آگئی ہے:-

أَخِي! قُلْ لِي وَلَا تَخْجَلْ بِمَا ذَا قَدْ تَرَقَّيْتَا ؟

میرے دوست سچ کہنا شرم کی ضرورت نہیں تم نے یہ ترقی کس طرح حاصل کی ؟

وَمَا أَنْتَ بِذِي جَاهٍ وَعُمْرَكَ مَا تَزَوَّجْتَا

نہ صاحب جاہ و ثروت تھے۔ اور نہ تم نے زندگی بھر شادی ہی کی !!

اللہ اکبر! یہ حالات کہاں نہیں ہیں؟ اللہ کا قانون عدل اندھا بہرا نہیں۔ قوموں کی تباہی یونہی نہیں ہوا کرتی۔ خوش نصیب ہیں، جو وقت آنے سے پہلے خبردار ہو جائیں۔

مصنف نے اس سلسلے میں علمائے ازہر کو خوب خوب سنائی ہیں۔ "بداخلاقیوں اور فواحش کے سیلاب کے خلاف تو علمائے کرام گاہے گاہے بادشاہ سلامت اور وزیر اعظم کی خدمت میں عریضہ گذران دیتے ہیں، لیکن معاشی استحصال اور کسانوں پر جور و ظلم کے خلاف کبھی ان کی زبان نہیں کھلتی۔ یہ بات کیا ہے؛ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سے ان کے حلوے مانڈے میں فرق آنے کا اندیشہ ہو؟ (صفحہ ۱۹)

علمائے ازہر کے تصور دین پر بھی مؤلف نے جا بجا سخت تنقید کی ہے (صفحہ ۶، ۸۰، ۱۲۹، ۱۳۳)۔ نیز علماء اور رجال دین کی طبقہ واری اجارہ داری کی سخت مخالفت کی ہے:-

"علماء اور صوفیوں کے لباس کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ لباس ہی اسلامی اور غیر اسلامی کی تفریق نہیں۔ اسلام نے انسانوں کے لیے کوئی لباس مقرر نہیں کیا لباس

ایک مقامی اور ملکی مسئلہ ہے ۔ تاریخ و روایات سے اس کا گہرا تعلق ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جبہ اور قفطان[1] زیب تن نہیں فرمائے تھے . . . . . .

آخر ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے لباس میں کیوں ممتاز ہو ؟ اسلام میں رجالِ دین کا کوئی منصب نہیں ۔ اور نہ یہاں اہلِ کلیسا کا کوئی خاص طبقہ ہے جس کے توسط کے بغیر مذہبی شعائر ادا نہیں ہو سکتے ۔" (ص ۸۵)

اسی طرح مصر کے موجودہ معاشی نظام کی خرابیوں اور سیاسی پارٹیوں کی اخلاقی کمزوریوں کی طرف بار بار توجہ دلاتی ہے ۔ مصنف کی رائے میں سیاسی پارٹیوں کے باہمی اختلافات صرف وزارتوں اور پارلیمنٹ کی نشستوں کے لیے ہیں ، غریبوں اور مصیبت زدہ طبقوں کے مقابلے میں سب ایک ہیں ۔ (ص ۱۳۲)

سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ پرجوش مصنف کے نزدیک ان تمام خرابیوں کا حل "اسلام" ہے اور اسی لیے وہ بار بار اسلامی نظامِ حکومت کی برملا دعوت دیتا ہے اور اپنے ہم وطن غفلت کے ماروں کو متنبہ کرتا ہوا کہتا ہے :" اب بھی ہوشیار ہو جاؤ ۔ اگر اسلام کو اختیار نہیں کرتے ، تو پھر کمیونزم کی فتنہ سامانیاں تمہیں تباہ کر کے رہیں گی ۔ یہ غیر فطری صورت حال دیر تک قائم نہیں رہ سکتی ۔"

مزید اطمینان کی چیز یہ ہے کہ ابھی مصنف کا آغازِ سفر ہے ۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے قلم سے اور مفید کتابیں نکلیں گی ۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعتدال اور حسنِ عمل کی توفیق دے ۔ ہماری بہترین توقعات ان سے وابستہ ہیں ۔ محمد الغزالی اور ان کے رفقاء کی تالیفات نوجوان طبقوں میں اتنی مقبول اور مؤثر نہیں ہو سکتیں جتنی سید قطب جیسے جدید طرز کے روشناس ادیب کی ۔

(۷) (الف) اسمعی یا مصر ! (اے مصر ! سن !!) چھوٹی تقطیع ، ۱۵ صفحے ۔

(ب) الدعوۃ الاسلامیۃ وتطورات اتہا فی الھند (ہندوستان میں اسلامی دعوت اور اس کی عہد بہ عہد تبدیلیاں) متوسط تقطیع ، ۳۲ صفحے ۔

(ج) أرید أن أتحدث إلی الاخوان (میں اخوان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں) ، چھوٹی تقطیع ، ۲۹ صفحے ۔

[1] علمائے مصر کا لباس ۔

(د) شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال۔ چھوٹی تقطیع، ۸۰ صفحے۔

(ھ) المد والجزر فی تاریخ الاسلام۔ متوسط تقطیع، ۶۴ صفحے۔

طباعت اور کاغذ مصری مطبوعات کی روایات کے مطابق قیمتیں درج نہیں، شاید مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ سے مل سکیں۔ یہ پانچ چھوٹے بڑے پمفلٹ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شتابِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ مصنف اپنی تبلیغی مہم کے سلسلے میں ایک عرصے سے عرب ملکوں کے دورے پر ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے جابجا خطبے بھی ارشاد فرمائے ہیں۔ زیرِ نظر رسالے مصر کے دورانِ قیام میں لکھے گئے اور وہیں سے چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے مصری مطبوعات کے ضمن میں ان کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

(الف) پہلا پمفلٹ ایک مقالے کے طور پر، قاہرہ کے مشہور ادبی ہفتہ وار رسالہ (الرسالہ) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مصر کو اس کی مرکزی حیثیت اور اس کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ باتیں اچھی اور دردمندی کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ مگر جس حلقے کا انتخاب کیا گیا ہے، وہاں اس قسم کی سنجیدہ باتوں پر کان دھرنے والے بہت کم ہیں۔

(ب) دوسرا پمفلٹ موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس میں مصنف نے ہندوستان میں اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ مگر افسوس کہ سید شہیدؒ کی دعوتِ تجدید و جہاد کے بعد وہ تحریک کی صحیح تاریخ نہیں بیان کر سکے ہیں۔ مشہدِ بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کے بعد ملک کے طول و عرض میں سید شہیدؒ کے ماننے والوں، ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں اور ان کے مشن کی خاطر گھر بار لٹانے والوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کا اس میں کہیں ذکر نہیں۔ کم سے کم سیرت سید احمد شہیدؒ کے مصنف سے ان کے نیازمند ایسی توقع نہیں رکھتے تھے۔ مزید برآں، دیوبند، ندوہ اور مدیر رسالہ ترجمان القرآن کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید مصنف کے نزدیک ایک تعلیمی و تہذیبی تحریک اور اقامتِ دین کی ہمہ گیر دعوت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ آخر میں مولانا محمد الیاس مرحوم کی دعوت و تبلیغ اور ان کی جاذب شخصیت اور ذاتی خصوصیات کا ایک گونہ مفصل اور مؤثر

تذکرہ ہے۔ ہندوستان کی مسلم حکومتوں کو مصنف نے بار بار اسلامی ریاست (الدولۃ الاسلامیہ) اور اسلامی حکومت (الحکومۃ الاسلامیہ) کے نام سے یاد کیا ہے، جو صحیح نہیں۔ غالباً یہ سہوِ قلم کا نتیجہ ہے۔

رسالہ کے آغاز میں مصر کے مشہور مسلمان صاحب قلم، سید محب الدین خطیب نے مصنف کا تعارف کرایا ہے۔ اس مختصر "تعارف نامہ" میں ان کی "ندویت" کی مناسبت سے ان کے اور ہمارے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی اور استاذ الاستاذ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا ذکر بھی آگیا ہے، اور بڑی محبت اور احترام کے لیے ہیں۔

(۳) تیسرے پمفلٹ میں مصنف نے الاخوان المسلمون والوں سے باتیں کی ہیں۔ یہ باتیں اچھی، معقول اور دلنشیں انداز میں کی گئی ہیں، مگر توقع کے خلاف ژولیدگی فکر یہاں اور نمایاں ہے۔ مصر میں اقامت دین کے علم برداروں کو لائق مصنف یہ سمجھانا چاہتے ہیں "کہ حکومت اور نظام حکومت کے قیام کا مطالبہ اسلام میں مطلوب و مقصود نہیں۔ حکومت، تو اللہ کی طرف سے انعام ہے۔ یہ طلب نہیں کی جاتی" کہنا یہی چاہتے ہیں، مگر کہتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں۔ اور اسی لیے اس موقع پر ان کے بیان میں تضاد سا رونما ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ "حکومت طلب نہیں کی جاتی۔ یہ نتیجے کے طور پر خود بخود ظہور میں آتی ہے، جیسے ایک درخت اپنے وقت پر پھل دینا شروع کرتا ہے" پھر آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"لیکن دعوت کے کسی مرحلے میں ـــ دعوت کے پھیل جانے اور دل و دماغ میں جاگزیں ہو جانے کے بعد ـــ اگر یہ کام حکومت کے بغیر ناممکن ہو، تو ہم دعوت اور دین کی خاطر اس کے لیے جدوجہد کریں گے، جیسے وضو کے لیے پانی کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن اسی ذہنیت اور اسی کردار اور پاکیزگی اخلاق کے ساتھ . . الخ الخ۔ (ص۲۷)

لہ ص۲۱ (ملخص)

ہم گنہگار بھی دعوت کے ایک مخصوص مرحلے ہی پر تبدیلی زعامت وقیادت کی مہم شروع کرنے کے قائل ہیں، اور اسی امانت و دیانت اور خلوصِ نیت و پاکیزگیٔ اخلاق کے ساتھ، جو ایک داعیٔ حق کی خصوصیات ہیں۔ لیکن دعوت کے اصول و مبادی تو اول روز سے واضح اور روشن ہونا چاہئیں۔ پتہ نہیں، ہمارے ملک کے ایک اچھے خاصے ذی علم اور سمجھدار طبقے کے دل و دماغ میں یہ بات کہاں سے سماگئی ہے کہ پاکستان میں تحریکِ اقامتِ دین کے داعی یا مصر میں "الاسلام دین و دولت" کی دعوت دینے والے حکومت کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ حصولِ جاہ و اقتدار کے لیے حکومت کی طلب یقیناً مذموم اور بدترین چیز ہے۔ لیکن اللہ رب العالمین کے قانون کو جاری و نافذ کرنے کے لیے زمامِ اقتدار صالحین کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرنا، اگر اسلام میں مطلوب نہیں، تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام میں کیا چیز مطلوب ہے؟ کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی نظامِ حکومت کی داغ بیل ڈالنا نہیں شروع کر دی تھی؟ اور کیا ہجرت کے پہلے ہی سال قریش کے تجارتی راستوں کی ناکہ بندی نہیں شروع کر دی تھی؟ اور مدنی زندگی کے بالکل آغاز میں یہود سے معاہدہ کس لیے ہوا تھا؟ سچ یہ ہے کہ جو حضرات اقامتِ دین کی جدوجہد کو اس پہلو سے صحیح نہیں خیال کرتے، وہ دانستہ یا نادانستہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ حکومت و اقتدار جاہ پرستوں اور اقتدار پسندوں کے حوالے کر کے خانقاہ میں اللہ اللہ کرنا ہی عین اسلام ہے۔ افسوس کہ زیرِ نظر پمفلٹ میں بھی اسی طریقِ فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔

(د) چوتھا رسالہ ڈاکٹر اقبال پر ہے اور عربی زبان میں اقبالیات پر ایک قابلِ قدر اضافہ۔ لائق مصنف کا متنوع ذوق اور گوناگوں دلچسپیاں لائقِ رشک اور قابلِ داد ہیں۔ اس میں ایک جگہ وہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم (مدیر مخزن) کو "الشیخ عبدالقادر" لکھ گئے ہیں، جو علم کی چوک معلوم ہوتی ہے۔ عربی میں "الشیخ" سے مخصوص قسم کے علماء ہی کا تصور ذہن میں آسکتا ہے۔

(ہ) پانچویں پمفلٹ میں تاریخ اسلام کے مدوجزر پر اچھے اور دلنشیں انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار سے عروج و زوال اور اخلاقی مدوجزر، دونوں کے شواہد مستند

واقعات درسِ عبرت کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ رسالہ موضوعِ بحث کے لحاظ سے مختصر، مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

یہ رسالے عربی زبان میں ہیں۔ عربی زبان میں کسی کتاب کا ہونا یوں کوئی متعجب اور خاص اہمیت کی چیز نہیں۔ مگر ان رسالوں کا عربی زبان میں ہونا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف عربی کے مشاق انشا پرداز اور صاحبِ طرز اہلِ علم ہیں۔ یوں تو برِصغیر پاک و ہند میں عربی جاننے والوں کی کوئی کمی نہیں، مگر لکھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ بہر حال اس ملک میں گنتی کے جو دو چار عربی کے مستند اہلِ علم ہیں، ان میں مصنف کا بھی شمار ہے، بلکہ انہیں اپنے ہم چشموں میں نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اب ان ۔ سل کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ عرب ملکوں کے مسلسل سفر اور طولِ قیام نے ان کی زبان میں مزید جلا پیدا کر دی ہے اور ان کا طرزِ نگارش اور بھی نکھر گیا ہے۔ علی میاں (مصنف اپنے نیاز مندوں کے حلقے میں اسی مختصر اور محبوب نام سے یاد کیے جاتے ہیں) اپنی عام زندگی، معاشرت اور رہن سہن میں تو حد درجہ سادہ بلکہ متقشف واقع ہوئے ہیں، مگر انشاء تحریر میں وہ اچھے خاصے روشن خیال، اور متجدد (ماڈرن) ہیں، اتنے متجدد کہ ان کے دیرینہ نیاز مندوں کو ان کا یہ تجدد اور روشن خیالی کھٹکتی ہے۔ زبان و انشا میں وہ جدید مصر کے پیرو اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ مصر کے اکثر نئے لکھنے والوں کی طرح وہ بھی احساسِ کمتری کے لیے مرکب النقص[1]، اور Against کے لیے ضد[2] استعمال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ Inferiority complex کا ترجمہ "مرکب النقص" بالکل لفظی اور مہمل ہے۔ اسی طرح ضد کے معنی تعیض کے ہیں۔ اس سے Against کا مفہوم کسی طرح ادا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں مثالیں نمونے کے طور پر دی گئی ہیں۔ راقم اپنی زندگی اور معاشرت میں آزاد ہونے کے باوجود ادب و انشا میں بے اعتدالی و آزادی کا حامی نہیں۔ یوں متجددین کی زبان میں اسے قدامت پسندی (محافظت) سے بھی تعبیر

---

[1] الدعوۃ الاسلامیہ۔ ص ۲۴

[2] شاعر الاسلام۔ ص ۲۲

کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ جگہ پیدائشی "ہندیت" کی پرچھائیں بھی نظر آتی ہے۔ اعوض عن اذنکم (آپ کی اجازت سے عرض کرتا ہوں) جیسا "اردو نما" فقرہ علی میاں کے قلم سے نکلنا حیرت انگیز ہے۔ شاید یہ فروگذاشت "بشریت" کی تکمیل کے لیے ہو۔ کہیں کہیں نحوی خامیاں بھی نظر آئیں، مگر ان سے کون بچ سکتا ہے؟

ان دو چار معمولی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر ان رسالوں کی زبان عربی انشا کا اچھا نمونہ ہے اور ایک ہندی نژاد کے لیے قابلِ فخر۔ اور اس کامیابی پر علی میاں، ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نوعمروں کو دین کی طرف مائل کرنے اور

خواتین میں صحیح اسلامی مزاج پیدا کرنے کے لیے

پندرہ روزہ **الحسنات** رام پور۔ یو۔ پی

کا مسلسل مطالعہ بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے

آپ بھی تجربہ کریں

سالانہ چندہ ۶/- فی پرچہ ۴/

پاکستان کے خریدار اپنی رقم دفتر اخبار کوثر گوالمنڈی لاہور بھیج کر رسالہ جاری کرائیں یا پھر وی۔ پی کے لیے ہمیں لکھیں ——— مینیجر

لہ التحدث الی الاخوان ص۵۱

مسئلہ تقدیر کا الٹا استعمال

نعیم صدیقی

(قسط دوم)

احکام جہاد اور مسئلہ تقدیر: جہاد کے لیے جو خطبات قرآن میں نازل ہوئے ہیں اُن میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جس میں جہاد کے احکام کے ساتھ ساتھ حقائقِ تقدیر نہ بیان ہو رہے ہوں۔ یہ محض اس لیے کہ جہاد کی قربانی پر اطمینانِ قلب کے ساتھ آمادہ کرنے میں ان حقائق کا علم ممد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ النسا میں جہاں فرمایا کہ "مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ ـــ الخ۔ وہاں دلوں کا چور پکڑا کہ تم شاید موت سے ڈرتے ہو تو سن لو کہ:۔

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ — تم جہاں بھی ہو (اپنے وقت مقررہ پر) موت تم کو آلے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ پناہ لیے ہوئے ہو۔

دیکھ لیجیے کہ موت کے اٹل تقدیر ہونے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ موت کا خوف دل سے الگ رکھ کے مسلمان فریضۂ جہاد پہ کمربستہ ہو جائے۔

اسی سلسلۂ کلام میں نفاق زدہ لوگوں کی ایک بیماری اور پکڑی کہ وہ "اطاعت رسول" میں اس لیے کوتاہ ہو رہے تھے کہ رسول پر پورا پورا اعتماد نہ تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ إِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللهِ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ یعنی کوئی اچھی صورت پیش آئی تو کہا کہ یہ تو اللہ کا کرم ہے اور کوئی تکلیف پہنچی تو رسول پر الزام رکھ دیا کہ اس کی تدبیر ہی ایسی تھی، ہماری رائے پر کام کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا۔ ان کو جواب دلوایا گیا کہ "كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللهِ!"

سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے بھلائی ہو یا برائی اُس کا وقوع اللہ کی مشیت ہی کے تحت ہوتا ہے
لیکن پھر ایک دوسرے پہلو سے اسی حقیقت کی جھلک یوں دکھائی کہ "جو بھی بھلائی تم کو پہنچتی ہے وہ تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ لیکن جو کوئی برائی تم کو ملتی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کے فساد کا نتیجہ ہوتی ہے" اللہ اسے تمہاری طرف پلٹا دیتا ہے۔

اس نظامِ تقدیر کو بیان کرنے سے سارا مقصد یہ تھا کہ "اطاعتِ رسول ﷺ کے بغیر اللہ کی اطاعت کے کوئی معنی نہیں۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔

اسی طرح آلِ عمران (آیات ۱۴۳ تا ۱۴۵) میں بھی جہاد ہی کے موضوع پر بات کرتے کرتے موت کے مقدر ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔

اور کسی جان میں یہ تاب نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے جو ایک وقتِ مقرر کے لیے قلمبند کیا گیا ہے

آلِ عمران ہی میں جہاد پر بات کرتے ہوئے منافقین کے اس فتنہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے متعلق یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ لوگ اگر ہماری مانتے اور ہماری طرح قدرانج کے رہتے تو مارے نہ جاتے۔ اس طرح کی باتیں مسلمانوں میں انتشار پیدا کرتی تھیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں بھی اپنی تقدیر ہی کا راز بیان کیا کہ

قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الیٰ مضاجعھم

کہہ دو (اے محمد!) کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی رہتے تو وہ لوگ بہرحال اپنی قتل گاہوں کی طرف نکلتے جن کے لیے قتل مقدر تھا۔

یہ کلمات جہاد سے جی چرانے والوں کے فلسفہ کے جواب میں کہہ کر جہاد کا جذبہ رکھنے والوں کی ہمت بندھائی جا رہی ہے۔ تقدیر کا بیان یہاں بھی معصیت سے روکنے اور طاعت پر ابھارنے کے لیے ہے۔

یہی گروہ منافقین پھر زد پہ آتا ہے۔ اس گروہ کا حال یہ تھا کہ مسلمانوں پر مصیبت پڑے تو

خوش، اور ان کو کامیابی ہو تو مغموم! جنگ احد میں جب مسلمانوں کو زک پہنچی تو یہ لوگ بغلیں بجاتے پھرتے تھے کہ دیکھو، ہم عقلمند تھے، میدانِ جنگ میں نہ گئے، اور تم بیوقوف تھے، موت کے منہ میں چلے گئے۔ مسلمانوں میں ان کی ان باتوں کا جو ردِ عمل پیدا ہو رہا تھا اُس کو صحیح رُخ پر ڈالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم سے یہ جوابی کلمہ کہلوایا کہ:

لَن يُّصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللهُ لَنَا ج هُوَ مَوْلٰنَا ج وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا بجز اس کے کہ اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہو۔ وہ ہمارا کارساز ہے اور چاہیے کہ اہلِ ایمان اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

اس جواب میں طمانیت، مضبوطی، استقامت اور توکل کی کیسی زوردار روح کام کر رہی ہے۔ لیکن کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس سے اُلٹا اپنے لیے بے اطمینانی، تذبذب، ڈھل مل یقینی اور مایوسی اخذ کریں۔

پھر کچھ اور کمزوریاں ہیں جو میدانِ جہاد میں اثر دکھاتی ہیں۔ ان کی طرف "منکم من یرید الدنیا" کہہ کر اشارہ کیا اور میدانِ احد میں اس کمزوری کا مزہ چکھایا۔ پھر اس واقعہ کا ذکر یوں کیا کہ:۔

اذ تصعدون ولا تلوٗن علیٰ احدٍ والرسول یدعوکم فی اُخرٰکم فاصابکم غمًّا بغمٍّ لکیلا تحزنوا علیٰ ما فاتکم ولا ما اصابکم

ذرا یاد کرو وہ موقع جب تم (آگے ہی آگے) چڑھے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے، حالانکہ رسول تم کو پیچھے سے پکار رہا تھا، چنانچہ (رسول کو) دکھ دینے کے بدلے میں تم کو بھی دکھ پہنچا ـــ (یہ توضیح اس لیے ہے کہ) نہ تو اس پر جو ہاتھ سے جائے اور نہ اس پر جو پیش آئے کوئی ملال کرو۔

یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والے کو تو نہ مالِ غنیمت کے ہاتھ سے جانے کی پروا ہونی چاہیے اور نہ موت کی نہ زخم لگنے کی، لیکن تم میں چونکہ دنیا پرستی کام کر رہی تھی اس لیے تم تھوڑی دیر کے لیے ابتلا میں آ گئے۔

اسی سلسلے میں یہ بتایا کہ خدا کی نافرمانی اور رسول کی ناراضی کے ساتھ الٹی سیدھی تدبیروں سے

جنگ آزمائی کرنا کس کام کا۔ اور اپنی کثرت پر اترانا چہ معنی، جبکہ فتح کا فیصلہ دراصل اللہ کی تقدیر سے ہوتا ہے۔ فرمایا:۔

ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم، وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ، وعلی اللہ فلیتوکل المومنون	اللہ اگر تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد اور کون ہے جو تمہاری مدد کرے۔ اور چاہیے کہ ایمان والے اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

آل عمران ہی کی بڑی مشہور آیت (۲۸-۲۷) جو جبریت کا خزانۂ نکات بن کے رہ گئی ہے، وہ بھی دراصل جہاد اور معرکہ ہائے کفر و دین ہی کے لیے مومنین کے جذبات کی آبیاری کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ٥ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ٥	کہو کہ اے ہمارے اللہ! تو ہی سلطنت کا مالک ہے، تو اپنے دستِ خیر و برکت سے جسے چاہے ملک (کی باگ ڈور) سونپ دے اور جس سے چاہے ملک (کی باگ ڈور) سلب کرلے، جسے چاہے غلبہ دے اور جسے چاہے ذلیل کردے! بلاشبہ تو ہر بات پر قدرت رکھتا ہے تو رات کو دن میں پروتا ہے اور دن کو رات میں پروتا ہے اور زندہ کو مردہ میں سے برآمد کرتا ہے اور مردہ کو زندہ میں سے، اور تو جسے چاہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے۔

اس آیت میں اہلِ ایمان کو جس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمہارے دشمن اور حق کے مخالفین چاہے کتنے ہی دبدبے اور طنطنے دکھائیں، کتنی ہی تیاریوں کا مظاہرہ کریں، کیسے ہی جبار بنیں، قوت اور ساز و سامان پر کتنا ہی کبر دکھائیں اس دنیا کے نظم پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

اصل اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور وہ جب ایک نئی اُبھرتی ہوئی اور بظاہر کمزور سی قوت کو اقتدار دینا چاہے تو اس کا راستہ کوئی روک نہیں سکتا اور وہ جس بڑی سے بڑی قوت سے تسلط کا منصب واپس لینے کا فیصلہ کرے، پھر اس کا کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ وہ غلبہ رکھنے والوں کو مسندِ نخوت سے نیچے پٹخ دے یا ان کے پیروں میں روندے جانے والوں کو اٹھا کر عزت کے تخت پر بٹھا دے، کسی کا دانت بیچ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ مایوسی اور مصیبت کی تاریکیوں میں سے امیدوں اور کامرانیوں کی صبح کو ابھار کے لاتا ہے اور کفر و شرک کی شبِ تیرہ کے شکم سے ایمان و اسلام کا سورج برآمد کرتا ہے۔ اور پھر وہی ہے جو متکبرین کے کبر اور مترفین کی عیاشیوں اور ظالمین کے ظلم و ستم کے دن کو نامرادی کی رات میں بدل دیتا ہے۔ وہ عالمِ جسمانی میں بھی اور روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی مردوں کے اندر سے زندگی کا طوفان اٹھا دے تو، اور ایسے ہی وہ زندوں کو مردوں میں بدل دے تو، کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ اور پھر وہی ہے کہ کسی سے مادی و روحانی رزق سلب کر لے اور کسی پر اپنے رزق کے دروازے کھول دے تو آڑے آنے والا کوئی نہیں۔

یہ آیت اپنے مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر آیتِ انقلاب ہے، یہ مشیت کے نظامِ تغیر کو واضح کرتی ہے اور وہی بات کہتی ہے جسے حضرت عیسیٰ نے کہا کہ کتنے ہی آگے ہیں کہ جو پیچھے ہو جائیں گے اور کتنے ہی پیچھے ہیں کہ جو آگے آ جائیں گے۔ مگر ساتھ کے ساتھ یہ آیت اس غلط فہمی کو بھی دور کرتی ہے کہ تغیرات کا تقدیری نظام کوئی غیر حکیمانہ نظام نہیں ہے کہ تقدیر اندھے کی لاٹھی کی طرح حرکت کرے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دستِ خیر کے ذریعے ہو رہا ہے اور ہر تغیر کے پیچھے حکمت و مصلحت موجود ہے اور ہر الٹ پھیر کے لیے قوانین ہیں۔ اس آیت میں "بِیَدِكَ الْخَیْرُ" کے الفاظ ہی اصل سرچشمۂ تسلی ہیں کہ خدا تعالیٰ جب سارے تغیرات خیر کے لیے کر رہا ہے تو پھر وہ لوگ جو ایک نظامِ خیر و فلاح کے لیے معرضِ کشمکش میں ہوں ان کو مطمئن ہونا چاہیے کہ تبدیلی آئے گی تو ان کے ہی حق میں آئے گی۔

اس آیتِ انقلاب کا اصل منشا کشمکش اور جہاد کے مراحل میں مومنین کو ثبات عطا کرنا تھا، لیکن دنیا نے اسے بھی جبریت کے سرد خانے (Cold storage) میں رکھ کر ٹھنڈا کر دیا ہے۔

اس آیت سے کچھ اوپر یہی حقیقت ایک اور انداز میں واضح کی گئی ہے۔ یہ نصیحت کرتے ہوئے کہ اگر تم پر ذرا کچھ آنچ آ گئی ہے تو اس کی وجہ سے نہ تو ڈھیلے پڑو اور نہ ملول ہو کے پڑ رہو، جہاں تم کو گزند پہنچا ہے وہاں دوسروں کو بھی پہلے گزند پہنچ چکا ہے، خود نظامِ تقدیر کا ایک گوشہ بے نقاب کر دیا گیا:-

وتلك الایام نداولها بین الناس۔ اور ان دن برے اور بھلے، ایام کو ہم اسی طرح لوگوں کے درمیان گردش دیتے ہیں۔

مطلب یہ کہ نفع و نقصان، کامیابی و ناکامی، مایوسی و امید، فتح و شکست کے حوادث کا تو ایک چکر ہے جسے قدرتِ الٰہی بار بار گھما رہی ہے کہ کبھی تاریک رُخ سامنے آ جاتا ہے اور کبھی روشن رُخ، کبھی دن ہے کبھی رات، کبھی اپنی بن آتی ہے کبھی مخالف کی، اور جن کو اپنا راستہ بنانا ہوتا ہے وہ حوادث کے اسی الٹ پھیر کے درمیان سے بنالے جاتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی یہ توضیح بھی کر دی گئی ہے کہ گردشِ تقدیر کا ایک اصول یہ ہے کہ کفار کے مقابلے میں غلبہ اہلِ ایمان ہی کو ملتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں اہلِ ایمان ہوں۔ مسلمانوں میں یقین و طمانیت پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ واضح اور کونسے الفاظ ہونگے۔

پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اسی گردشِ ایام کی کٹھالی میں پڑ کر تو وہ ایمان والے نکھرتے ہیں کہ جن کو اللہ منصبِ شہادت کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ اس اشارے میں خود یہ دعوت شامل ہے کہ منصبِ شہادت کے قائل ہو اور آزمائش آئے تو کھرے بن کر نکلو۔

آیت مدد جہد میں زیادہ سنبھلنے کی دعوت دے رہی ہے، مگر یہی آیات ہیں کہ جن کا موقع و محل نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ ان کو جمود و ملال ہی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں قصۂ طالوت کے اندر ایک حقیقتِ تقدیر یہ بھی واضح کی گئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نظامِ مشیت نہ بناتا جس میں بگڑ جانے والوں کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے دوسرے بہتر لوگ اٹھائے جاتے رہیں تو ساری زمین اخلاقی فساد سے بھر جاتی۔ یہاں پھر یہ اشارہ اخذ ہوتا ہے کہ قسمتانِ حق

کا جو فیصلہ آج تم دیکھتے ہو اسے تہ و بالا کرنے ہی کے لیے تو نظام تقدیر کے تحت تم میدان میں آئے ہو۔ پھر جھجک کیسی! ہمت سے کام لو اور ٹکرا جاؤ!

تحریب انفاق کے لیے بیان تقدیر | انفاق بھی طاعت الٰہی کا ایک بڑا شعبہ ہے۔ چنانچہ رزق کا نظام تقدیر بالعموم ان مواقع پر واضح کیا گیا ہے جہاں انفاق کی ترغیب دلانا مطلوب تھا۔ مگر کتنی عجب بات ہے کہ رزق کے نظام تقدیر کو زرپرست بخیلوں نے انفاق سے گریز کے لیے دلیل بنایا ہے! سورۂ یٰسین میں دیکھیے:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ ۔ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۔

اور جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے انفاق کرو تو یہ کفر کرنے والے ایمان والوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ کیا ان لوگوں کو ہم کھلائیں جن کو اگر اللہ نے کھلانا چاہا ہوتا تو خود کھلاتا۔ تم لوگ تو نہایت واضح گمراہی میں مبتلا ہو!

دیکھیے طاعت سے بچنے کے لیے کس شاندار طریق سے مسئلہ تقدیر (جبریت) کو آڑ بنایا گیا تھا اپنی ذمہ داریاں اٹھا کے کفار نے خدا کے سر ڈال دیں۔ خدا کا تقدیر رزق کا نظام تو تفاوت کے ساتھ رزق دیتا ہے تاکہ آزمائش کا مقام پیدا ہو اور جہاں کچھ لوگوں کے لیے صبر و کسب لازم آئے وہاں دوسروں کے لیے شکر و انفاق واجب ٹھہرے لیکن جب ان سے مطالبہ ہوا کہ انفاق کرو تو وہ فرماتے ہیں کہ خدا خود ہی غریبوں کی دست گیری، یتیموں کی کفالت اور مساکین کی چارہ گری کیوں نہیں کر دیتا جب اس نے ان کو غریب و مجبور بنا یا ہے تو ہم کیوں بیچ میں مداخلت کریں۔

بات یہیں تک نہ رہی، بلکہ جب اللہ کے نام پر انفاق کا مطالبہ ہوتا تو کفار طنزاً کہتے کہ لو بھائی دیکھنا خدا غریب ہو گیا ہے اور اب ہم ہی غنی رہ گئے ہیں کہ اس کی کچھ مالی مدد کریں۔

لیکن قرآن تقدیر رزق کو بیان کرتا ہی ترغیب انفاق کے لیے ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں جہاں

مطالبہ کیا کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دو، یعنی اس کی راہ میں مال خرچ کرو تو ساتھ ہی یہ فرمایا کہ :-

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ۔ اور اللہ ہی (روزی کو) تنگ اور فراخ کرنے والا ہے۔

یعنی انفاق میں اس اندیشے سے کوتاہی نہ کرو کہ تمہارے حصے کا رزق کم ہو جائے گا اور تم جو کوں مرو گے نہیں جو اللہ انفاق کا حکم دے رہا ہے، روزی کو تنگ اور فراخ کرنے کے اختیارات بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں پس بخیل نہ بنو!

یہی بات سورہ بنی اسرائیل میں کہی جہاں یہ فرمایا کہ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ وہاں ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ :-

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۝ یقیناً تیرا آقا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع یا محدود کرتا ہے بیشک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔

یہاں بھی رزق کے نظامِ تقدیری کو اسی لیے بیان کیا کہ نہ اپنے اخراجات میں مُسرف بنو، نہ حق کی راہ میں صرف کرتے ہوئے بخیل بنو، بلکہ اعتدال سے چلو کہ اپنی ضرورتیں بھی پوری ہوں اور دین کی تحریک بھی چلے۔ اور انفاق کرتے ہوئے یہ یقین رکھو کہ رزق دینے والا مالک تمہاری ضروریات سے باخبر اور تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے اور رزق کی فراخی و تنگی کرنے کے سارے ذریعے اس کے ہاتھ میں ہیں ۔ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا " میں بالکل نمایاں طور پر شفقت اور کارسازی اور کفالت کی یقین دہانی موجود ہے۔

قتلِ اولاد کی ممانعت اور تقدیرِ رزق سورہ بنی اسرائیل میں اور دوسری جگہ بھی اہل عرب کو قتل اولاد سے روکا گیا ہے۔ عرب میں اولاد (خصوصاً بیٹیوں) کو جن وجوہ سے قتل کیا جاتا تھا ان میں سے ایک بڑی وجہ مفلسی کا ڈر بھی تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ کنبے کے افراد اگر بڑھ گئے (اور لڑکیاں بیاہی گئیں کما ڈتو ہوتی ہی نہیں) تو تنگ حالی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے بچوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ان سے

روکا اور اس کی اصل وجہ پر بھی گرفت کی:-

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ خَشْيَةِ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ !

اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم ان کو رزق دینے والے ہیں۔ اور خود تم کو بھی!

یہاں دیکھیے کہ ایک شدید گھناؤنی معصیت سے روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اطمینان دلایا ہے کہ رزق پہنچانا ہمارا کام ہے اور خوش حالی اور غریبی مقدر کرنے کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں ہیں کنبے کے افراد بڑھ جانے سے ضروری نہیں کہ خوش حالی کا خاتمہ ہو جائے اور ان کی افزائش کو روک دینے سے ضروری نہیں کہ افلاس سے بچا جا سکے۔ لہٰذا اس معصیت سے باز آجاؤ اور اپنی اُلٹی سیدھی تدبیروں سے اپنی تقدیر بنانے کی کوشش نہ کرو۔

اسی اصول پر لونڈیوں سے عزل کرنے کے بارے میں نبی صلعم نے ممانعت فرمائی اور وہاں بھی نظامِ تقدیر ہی کو طاعت پر آمادہ کرنے کا ذریعہ بنایا۔ فرمایا کہ تم کچھ بھی کرو جس جان کا پیدا ہونا مقدر ہے اسے کوئی تدبیر پیدا ہونے سے روک نہیں سکتی!

ہدایت وضلالت اور تقدیر ہدایت وضلالت بھی تقدیر کی بحثوں کا ایک بڑا موضوع رہا ہے۔ اس موضوع کو سب سے پہلے شیطان نے چھیڑا تھا۔ وہ حکم سجدہ کی تعمیل سے دیدہ و دانستہ خود انکار کرتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری کو سر سے اتار کر خدا تعالیٰ پر ڈالنے کے لیے کہتا ہے کہ "رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ" اس کا مدعا یہ تھا کہ میں تو طاعت ہی کرنا چاہتا تھا لیکن تیری مشیت نے ایسے حالات میرے لیے پیدا کر دیے کہ میں بغاوت پر بالکل مجبور ہو گیا۔ سرکشی میں نے کی نہیں، مجھ سے کرائی گئی ہے۔ کفر مجھے پسند نہ تھا، مجھ پر ٹھونسا گیا ہے۔ اپنے ان الفاظ کی روشنی میں شیطان فلسفۂ جبریت محضہ کا سب سے پہلا بانی ہے۔ مجرمین اور ضالین کی یہ خوشنما پناہ گاہ اسی کی بنائی ہوئی ہے۔

اسی شیطان کے شاگرد وہ بھی تھے جنہوں نے نبی صلعم کی دعوتِ ایمان وطاعت کے جواب میں یہ کہا تھا کہ:-

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ

اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا

مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا کسی کی عبادت نہ کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر
مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ کسی چیز کو اپنے لیے حرام ٹھیراتے!

یعنی ہمارا شرک اور خدا کے مقابلے میں ہماری شریعت سازیاں کچھ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ہم خود سوچ سمجھ کر اس چکر میں پڑے ہیں، بلکہ خدا نے خود ہم سے یہی چاہا ہے اور ہم کٹھ پتلیوں کی طرح یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر وہ چاہتا کہ ہم یہ کچھ نہ کریں تو وہ ہمیں باز رکھ سکتا تھا۔ ہم بتوں کے سامنے سر جھکانا چاہتے اور وہ ہماری گردنیں پکڑ لیتا، ہم کسی حلال شے کو حرام کہنے کا ارادہ کرتے اور وہ ہماری زبان کو باندھ دیتا، بھلا اس کی عظیم الشان طاقت کے مقابلے میں ہماری کیا بساط تھی کہ ہم اس کی مرضی کے خلاف کسی اور طرف قدم بڑھا سکتے۔

ان کلمات کے ذریعے ان لوگوں نے اپنے علم و اختیار کی، اپنے منصب خلافت کی، اپنی انسانیت کی، اپنے ارادہ و انتخاب کی، اپنی قوتِ تمیز کی کلی نفی کر دی اور سرے سے ذمہ دارانہ پن کی کوئی بنیاد ہی گویا نہ چھوڑی کہ اس بنیاد پر ان کو دعوتِ دین دی جا سکے۔

بھلا ان سے کوئی پوچھتا کہ اگر تم کسی جنگل میں بھٹک جاؤ تو کیا وہاں بھی اسی پوزیشن کو اختیار کرو گے کہ نہ کسی سے راستہ پوچھو، نہ غلط راستے کو چھوڑ کر دوسری طرف مڑو، بلکہ اگر کوئی بطورِ احسان تم کو بتائے بھی کہ یہ راستہ تو چیتوں کے بھٹ کی طرف جاتا ہے، شہر کو جانے والا راستہ اُدھر سے ہو کے گیا ہے تو تم اسے یہ جواب دو کہ اگر اللہ چاہتا کہ ہم اُس راستے پر چلیں تو وہ ہمیں خود ہی چلا دیتا، اب تو اس نے اِدھر ہی چلا دیا ہے لہٰذا اِدھر ہی چلیں گے، چاہے آگے چیتوں کے بھٹ ہوں یا آگ کے گڑھے؟

مگر نہیں، تقدیر کا یہ جاہلانہ تصور روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے کے لیے تھوڑی ہے۔ یہ تو صرف ایمان و اخلاق اور قلب و روح کی دنیا میں کام دیتا ہے۔

ایک اور جگہ تقدیر کے اسی استعمال کا تذکرہ یوں ہوا ہے:۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ اب یہ شرک کرنے والے (دعوت الی اللہ کے جواب میں

مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ○

یہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا نہ شرک کرتے اور نہ (مشرکانہ عقاید کے تحت) کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ ان سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں انہوں نے بھی ایسی ہی باتوں سے دعوتِ حق کو جھٹلایا، یہاں تک کہ ہماری گرفت کا مزہ چکھ کے رہے۔ پوچھیے ان سے کہ کیا تمہارے پاس (اس معاملے میں) واقعی کوئی علم ہے، اگر ہے تو لاؤ ہمارے سامنے۔ تم جن خیالات کے پیچھے چل رہے ہو وہ محض گمان ہیں اور تم محض تیر تکے چلاتے ہو!

تقدیر کا یہ تصور جو ضلالت پر جمے رہنے کی دلیل بن جائے اور جو ہدایت کی طرف مائل ہونے میں رکاوٹ ہے قرآن اسے ظن و گمان قرار دیتا ہے اور اس طرح کے خیالات کو کہ خدا لوگوں کو جبراً معصیت و ضلالت پر چلاتا ہے اور جسے ہدایت پر لاتا ہو اسے زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی کھینچ لاتا ہے، خدا کی کتاب میں "تیر تکے اڑانے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ سب فضول قیاسات اور لغو ملسفہ طرازیاں ہیں۔ تقدیر کا یہ تصور قرآن کا نہیں، مشرکین کا ہے؛ خدا کا دیا ہوا نہیں، شیطان کا ایجاد کردہ ہے۔

دراصل دشمنانِ حق جب یہ سنتے تھے کہ ہدایت دینے والا اللہ ہے تو وہ پوری بات نہ سمجھنے کی وجہ سے طنزاً اس طرح کے نکتے نکال کر دعوتِ حق کی مدافعت کرتے تھے۔ ان کا کہنا اصل میں یہ تھا کہ ایک طرف تو تم لوگ کہتے ہو کہ من یھد ہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، تو پھر تم ہمیں کس بنیاد پر یہ الزام دیتے ہو کہ ہم ضلالت میں خود پڑے ہیں اور کس بنیاد پر ہمیں بلاتے ہو کہ ہدایت قبول کریں؟ ہدایت و ضلالت جب خدا کے اختیار میں ہیں تو ہماری کیا ذمہ داری!

مگر مخالف کم بخت کی نگاہ ہمیشہ حقیقت کے پورے منظر کو دیکھنے سے کتراتی ہے اور ادھورے پر آتی ہے، پھر ساری بحثیں اور سارے نتیجے اسی ادھورے منظر پر کھڑے کئے جاتے ہیں۔

لوگوں نے یہ تو سن لیا کہ خدا ہدایت و ضلالت دیتا ہے۔ لیکن ان کے کان یہ نہ سن سکے کہ وہ کیا کرنے والوں کو ہدایت دیتا ہے اور کیا کرنے والوں کو ضلالت دیتا ہے۔ ان تک یہ بات تو پہنچ گئی کہ اللہ کے کرنے کے کام کیا ہیں لیکن یہ نہ پہنچی کہ بندوں کی ذمہ داریاں کہاں تک ہیں۔

قرآن نے خدا کے ہادی و مضل ہونے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جا بجا یہ بھی بتایا ہے کہ ہدایت و ضلالت کے دروازے کن لوگوں پر کھلتے ہیں، کن کنجیوں سے کھلتے ہیں اور کونسے افکار و اعمال کے ساتھ ان دروازوں میں کسی کا داخلہ ممکن ہوتا ہے، اور دونوں طرف کیا کیا قوانین کارفرما ہیں۔ ہدایت و ضلالت کی تقدیر میں انسان کا اپنا جو کچھ حصہ ہو سکتا ہے وہ خوب اچھی طرح کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

ہدایت و ضلالت کی تقدیر قرآن میں تمام تر اسی لیے بیان ہوئی ہے کہ لوگ ضلالت سے بچنے اور ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک طرف قرآن یہ بتاتا ہے کہ فلاں فلاں آلائشیں دل سے پاک کرو گے تو اس کے دریچوں سے اللہ کے نور کی شعاعیں داخل ہونگی اور فلاں فلاں حرکتیں کرو گے تو یہ دل کے دریچوں کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا موجب ہونگی۔ ہدایت کا ایک راز یہ ہے کہ مانگو گے تو ملے گا، کھٹکھٹاؤ گے تو دروازے کھلیں گے، اپنے حواس کی کھڑکیاں کھلی رکھو گے تو روشنی اور تازہ ہوا اندر آئے گی، تعصب کے پردے اٹھاؤ گے تو حقیقتیں تمہارے گھر میں داخل ہونگی، تم خود آگے بڑھو گے تو تمہارا استقبال کیا جائیگا، اپنی آنکھیں کھولو گے تو دیکھو گے اور اپنے کان لگاؤ گے تو سنو گے۔

قانون ہدایت یہ ہے کہ:۔

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○	اللہ (اپنے نور اور کتاب) کے ذریعے ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی رضا کے پیرو کار ہوں اور سلامتی کے راستوں پر چلیں، اور پھر وہ ان کو اپنے قانون کے تحت مختلف تاریکیوں سے نکال کر روشنی

میں لاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

یعنی ہدایت اس کے لیے ہے جو خدا کی رضا کو پیشِ نظر رکھے اور زندگی کے تمام معاملات میں سلامتی کے راستوں کا جویا ہو۔ یہاں تقدیرِ ہدایت بیان کرنے کا اصل تصور یہی ہے کہ طالبینِ ہدایت کو رضاءِ الٰہی کے اتباع اور سُبُل السلام پر چلنے کا جذبہ نصیب ہو۔ نہ کہ وہ آنکھیں بند کرکے چل نکلیں کہ اللہ خود ہی جدھر چاہے گا لے جائے گا۔

پھر فرمایا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ — اور وہ لوگ کہ جنہوں نے ہمارے لیے جدوجہد کی انہیں ہم (زندگی کے ہر میدان میں)، اپنے راستے بہرحال دکھائیں گے۔

یہ ہے اللہ کا قانون تقدیرِ ہدایت وضلالت کے بارے میں۔ اس کے بیان کا مدعا یہی ہے کہ لوگ ہدایت الٰہی کی طلب میں اس کے راستے میں جدوجہد کرنے کی اسپرٹ سے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر اللہ پر بھروسہ کریں کہ وہ ان کی رہنمائی کرے گا۔

فلسفۂ تقدیر کا الٹا استعمال اوپر کی چند مثالوں کو سامنے رکھ کر اگر آپ سوچیں تو یہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن کا فلسفۂ تقدیر ایمان وعمل اور جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ لیکن جو لوگ اسے جمود، معصیت، خواہش پرستی اور بے دینی کے جواز کی دلیل بناتے ہیں دراصل ان کا فلسفۂ تقدیر ہے ہی بالکل دوسرا۔ ان کا نظریۂ تقدیر قرآن کے بالکل برعکس ہے ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند